بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جذبۂ فنا کے کئی ایک مدارج اور متعدد صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی شخص کسی اعلیٰ اور ارفع نصب العین کو اپنا کر اس میں اس طرح کھو جائے کہ اسے اپنے وجود تک کی بھی خبر نہ رہے یا کسی پاکیزہ سیرت و کردار رکھنے والے شخص کی سیرت کی پاکیزگی اس کے دل و دماغ کو اس حد تک متاثر کر دے کہ وہ اس میں بالکل جذب ہو کر رہ جائے۔

جذبۂ فنا کی ان دونوں صورتوں میں جو صورت بھی ہو مگر ان میں ایک چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ انسان اس جذبے سے تعمیر و ترقی کا کام لیتا ہے۔ نصب العین میں "فنائیت" اس کے اندر بے پناہ قوت، لازوال عزم اور مقصد کے حصول کے لیے غیر معمولی جذبۂ ایثار پیدا کرتی ہے اور پاکیزہ سیرت و کردار رکھنے والی شخصیت کے اندر فنائیت اس کی اپنی سیرت کو پاکیزہ بنا دیتی ہے۔

یہ جذبۂ فنا اگر ایک طرف اپنے اندر خیر کے متعدد پہلو رکھتا ہے تو دوسری طرف اس میں شر کے بھی بے شمار پہلو پائے جاتے ہیں۔ جب نصب العین گھٹیا اور مقاصد ناپاک ہوں تو پھر جو افراد اور قومیں ان میں اپنے آپ کو کھو دیتی ہیں وہ بھی افکار و نظریات اور سیرت کے اعتبار سے انتہائی پست سطح پر اتر آتی ہیں اور نہ صرف اپنے آپ کو برباد کرتی ہیں بلکہ قوموں اور نسلوں کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ یہی حال بدقماش، فساق و فجار اور حامیانِ ظلم و استبداد کے عشق میں فنا ہونے والوں کا ہوتا ہے۔ ان کا جذبۂ فنا انہیں بربادی کے ان مہیب غاروں میں دھکیل دیتا ہے جن میں ان کے "مثالی انسان" ان سے پیشتر گر کر تباہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

اسے قدرت کی ستم ظریفی کہیئے کہ تعمیر و ترقی کے معاملے میں تو کوئی فرد یا قوم اپنے نصب العین سے بڑھ

کہ کبھی کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتی بلکہ اپنے سارے اخلاص کے باوجود مکمل نصب العین تو کیا اس کا ایک حصہ بھی بمشکل حاصل کرتی ہے۔ یہی صورتِ حال نیک افراد کی بلند سیرتوں کو اپنانے کے معاملے میں پیش آتی ہے۔ "فنا فی الشیخ" کا جذبۂ صادق رکھنے کے باوجود مسترشد مرشد کے سارے اوصاف کو کماحقہٗ اپنے اندر پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس جب کوئی فرد اور قوم پست مقاصد اور گھٹیا انسانوں کے عشق میں کھو جائے تو وہ پستی اور گھٹیا پن میں ان پستیوں سے کہیں زیادہ نیچے گر جاتی ہے جو آغاز سے اس کے پیشِ نظر ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انسان سربلندی تو مشکل سے ہوتا ہے مگر پستی کی طرف بڑی سرعت سے لڑھک جاتا ہے۔ چنانچہ جن افراد اور قوموں نے کسی ارفع و اعلیٰ نصب العین کو اپنا کر تعمیر و ترقی کی راہ اختیار کی انہیں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں اور ان کے مقابلے میں جن لوگوں نے تخریب اور تنزل کو اپنی منزل ٹھہرایا انہوں نے بکمال عجلت ملکوں اور قوموں کو برباد کر کے رکھ دیا۔

اسے اس ملک کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ مقاصد اور سیرت و کردار کے ارفع نمونوں کو اپنانے کا جذبہ اور رجحان قریب قریب ختم ہوتا جا رہا ہے اور ناپاک مقاصد کی پیروی اور خدا سے غافل انسانوں کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو اپنانے کا جذبہ بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے خصوصاً اس ملک کے برسرِ اقتدار طبقوں کے اندر یہ رجحان تو فنائیت کی حد تک نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس پستی تک خدا کے نافرمان بندے اپنی ساری بداعمالیوں کے باوجود صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پہنچے ہم اس منزل تک بہت جلد پہنچ گئے ہیں۔ اور اگر ہمارے اشرافیہ کی یہی حالت رہی تو ہم نہ صرف خدا کے ان نافرمانوں کی ساری برائیاں بڑی تیزی کے ساتھ پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیں گے بلکہ فسق و فجور، ناانصافی، ظلم و استبداد، حرصِ دنیا اور بے اصولے پن میں ان سے بھی اس حد تک آگے بڑھ جائیں گے کہ خود انہیں ہمارے کرتوتوں کو دیکھ کر وحشت ہوگی

تہذیبِ مغرب کے عشق میں مبتلا ہمارے ملک کی "موثر اقلیت" نے، جو غالباً ہماری شامتِ اعمال کی بنا پر، اول روز ہی سے پاکستان کی ہیئت حاکمہ بھی چلی آ رہی ہے، ہمارے معاشرے کو بڑی سرعت کے ساتھ مغربی اقدار کے سانچوں میں ڈھال دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے والی

قوم کے دل و دماغ پر اب لندن، پیرس، ماسکو اور واشنگٹن کے معاشروں کی پیروی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اگر آپ مغربی تہذیب کے ساتھ اس کے اس جذبۂ فنا کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس نے مغرب کے ساتھ گہری محبت و عقیدت کے باوجود صرف اس تہذیب کی برائیوں کو ہی اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی کسی اچھائی کو اپنانا تو کجا اُسے اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ جب رخ پستی کی طرف ہو اور ذہنی میلان بھی پست ہی ہو تو بلندی کی طرف آخر انسان کیونکر بڑھ سکتا ہے۔ مغربی تہذیب بھی دوسری مادی تہذیبوں کی طرح پہلودار تہذیب ہے۔ اس کے اندر تخریب کے لاتعداد پہلوؤں کے ساتھ کچھ پہلو تعمیر کے بھی ہیں کیونکہ اگر اس میں تعمیر کے یہ پہلو نہ ہوتے تو وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے آپ کو برقرار نہ رکھ سکتی۔ لیکن ہمارے "اشراف" اُس کے جس پہلو پر فریفتہ ہوئے ہیں وہ اس کی "لذت پرستی" ہے۔ اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ ہماری قوم کی اکثریت ان بلند اور پاکیزہ مقاصد سے جن کی بناء پر ہمیں بارگاہِ ایزدی سے "امتِ وسط" کی خلعت عطا ہوئی تھی ـــــ ناآشنا ہو کر حرص و آز کی غلام بنتی جا رہی ہے۔ جب کسی قوم کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین موجود نہ رہے اور اس کی جدوجہد کی حدِ کمال چند لذات کا حصول قرار پائے تو اس سے نہ صرف اس کے اخلاق تباہ ہوتے ہیں بلکہ اس کے ضمیر پر بھی موت طاری ہو جاتی ہے۔ مذہب کے ساتھ تعلقِ خاطر کے باوجود اس کی عملی زندگی میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جسے دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ یہ قوم کسی متعین اسلوبِ حیات کی علمبردار ہے اور اس اسلوبِ حیات کی وجہ سے اس کے افراد حلال و حرام اور پسند و ناپسند کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور اس نقطۂ نظر سے ہٹ کر وہ کبھی کوئی ایسا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے جس سے اس امتیاز کے مٹ جانے کا خطرہ ہو۔

پاکستانی قوم میں لذت پرستی کے جنون نما دہ پرستی کی راہ ہموار کی ہے۔ اور اس کے اخلاق کی جڑوں کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے اور اسے اس حد تک بے ضمیر بنا دیا ہے کہ اس کی ایک بہت بڑی اکثریت معمولی سے دنیوی مفادات کی خاطر بڑے سے بڑے دینی اصول اور اخلاقی ضابطے کو نظر انداز کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ عوام و خواص دونوں ان ذرائع و وسائل کے حصول میں منہمک ہی نہیں بلکہ جذبۂ فنا کی منازل طے کرتے نظر آتے ہیں خواہ اس انہماک و استغراق میں انہیں ایمان جیسی متاعِ گراں مایہ ہی سے ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں۔ ایک انسان کی زندگی میں اصل اہمیت اس چیز اور اصول کو حاصل ہوتی ہے جسے وہ

سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے اور جس کے سامنے وہ دنیا کی ہر دوسری چیز کو ہیچ سمجھتا ہے۔ مسلم قوم کو جب متاعِ ایمان سب سے زیادہ عزیز تھی تو وہ دنیا کی ہر دوسری متاع کو اس کے لیے قربان کرنے پر آمادہ رہتی تھی اور کبھی اس بات کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بڑے سے بڑے دنیوی نفع کے لیے اسے نظر انداز کر دے گی۔ دنیوی مال و اسباب تو کیا ایمان کے مقابلے میں اس کے افراد جان کو بھی کسی قدر و قیمت کا حامل نہ سمجھتے تھے اور جان دے دینے کے بعد بھی زبانِ حال سے یہی کہتے تھے:

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" مگر آج چونکہ نصب العین کا محور تبدیل ہونے سے فکر و نظر کے زاویے، خوب و ناخوب کے پیمانے اور بھلائی اور برائی کے معیارات اور جد و جہد کے رخ بدل گئے ہیں اس لیے اب حال یہ ہو گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے دنیوی فائدوں کی خاطر بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایمان اور ضمیر کے سودے کیے جاتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک معمولی سی اقلیت کو چھوڑ کر اس ملک کی عظیم اکثریت کا ضمیر ایک قابلِ بیع و شری چیز بن کر رہ گیا ہے۔ وہ لوگ جو معاشرے میں کوئی موثر قوت نہیں رکھتے انہیں معمولی سا لالچ اور دباؤ اپنے ضمیر کے خلاف فیصلہ کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے اور جو معاشرے میں ذرا نمایاں مقام رکھتے ہیں انہیں ان کے حسبِ مرتبہ مناصب یا بعض دوسری مراعات جادۂ مستقیم سے بآسانی ہٹا سکتی ہیں۔ بات اگرچہ بڑی تلخ ہے مگر ہے حقیقت کہ ہمارے ملک کے فرمانرواؤں نے عوام و خواص کو با ضمیر انسان بننے کی تربیت دینے کے بجائے ضمیر کو باقاعدہ بیچنے کے ڈھنگ سکھائے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں سیر چشم، قانع، با اصول، غیرت مند اور با ضمیر انسانوں کی تشویشناک حد تک کمی ہو گئی ہے اور ان کی جگہ طامع آزماؤں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قوم کی ایک بھاری تعداد ضمیر کو منڈی کا مال سمجھ کر ہمیشہ گاہکوں کی تلاش میں رہتی ہے کہ کب کوئی اس کا سودا چکا کر اسے اپنی نخویل میں لے لے۔ مگر ضمیر کے گاہک بھی غالباً اپنے ضمیر بیچ بیچ کر اس شعور اور احساس سے یکسر محروم ہو چکے ہیں کہ جن لوگوں کے ضمیر آج بناسپتی گھی کے چند ڈبوں اور کھانڈ کے چند سبروں یا زیادہ سے زیادہ چند پرمٹوں یا بھتیجوں، بھانجوں اور بیٹوں کو ملازمت دلوانے کے عوض خریدے جا سکتے ہیں کیا وہ بہ ضمیر کل دوسرے گاہکوں کے ہاتھ جہاں سے انہیں بہتر قیمت وصول ہونے کی توقع ہو ــــ بیچنے پر تیار نہ ہوں گے۔ ضمیر کو جب ایک مرتبہ منڈی کا مال بنا دیا جائے تو پھر اس کے فروخت کنندگان اس بات سے بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ کون کس وقت اسے خرید رہا ہے انہیں تو اسے بیچنا

ہی ہے جو زیادہ دام ادا کرے وہ اسے بخوشی اس کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اس وقت جو خوفناک سیاسی بحران پیدا ہوا ہے اس کے اسباب کا اگر کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا سب سے اہم سبب قوم کو بے ضمیر بنانے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش ہے۔ ایک فرد یا مختصر سے گروہ نے اقتدار پر قبضہ کرنے اور قبضہ کرنے کے بعد اس کے ساتھ چپکے رہنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ ہر جائز اور ناجائز طریق سے ان تمام افراد اور گروہوں کو خرید لیا جائے جو اس کے لیے کسی وقت بھی وجہِ پریشانی بن سکتے ہیں۔ اِدھر ان افراد اور گروہوں کی بہت بڑی تعداد نے دنیوی مفادات کے حصول اور پھر ان کے تحفظ کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ کسی طرح حکومت کے ایوانوں میں ان کی رسائی کا کوئی سامان پیدا ہو اور اس طرح معاشرے اور انتظامیہ میں انہیں اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے مواقع میسر آسکیں تاکہ وہ اس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ دنیوی منافع حاصل کر سکیں اور کسی میں یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہو کہ حضور مال و متاع کی صورت میں یہ جو کچھ اکٹھا کیا جا رہا ہے اس کے لیے آپ کے پاس کونسا اخلاقی اور قانونی جواز ہے۔ ضمیر کی اس سوداگری نے سب سے پہلے مسلم لیگ کو تباہ کیا۔ اس کی تباہی کے بعد پھر یہ بے ضمیر لوگ ریپبلیکن پارٹی کی طرف ٹوٹ پڑے اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ یہ فنا کے گھاٹ نہ اتر گئی پھر جب فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب نے تختِ اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد کنونشن لیگ کی تشکیل کی تو نفس کے یہ بندے بڑی عقیدت کے ساتھ جوق در جوق اس میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بظاہر یہ ایک مضبوط پارٹی بن گئی مگر اس کی قوت اور شان و شوکت کا سارا دار و مدار صرف فیلڈ مارشل صاحب کا تختِ شاہی پر فائز ہونا تھا۔ جب ان کا سنگھاسن ڈولتا دکھائی دیا اور بھٹو صاحب مستقبل قریب میں حکمران بنتے نظر آئے تو یہی لوگ کنونشن لیگ کو داغ دے کر پیپلز پارٹی میں آ شامل ہوئے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے دوسروں کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر صاحبِ اختیار کو اس امر کا یقین دلانے لگے کہ ان کا اگر اس ملک میں کوئی حقیقی خیر اندیش اور بہی خواہ ہے تو یہ ناچیز خادم ہی ہیں۔ باقی سب اُن کے بد اندیش اور دشمن ہیں۔ اس لیے اُن کی نظرِ کرم کے صرف وہی مستحق ہیں۔ اس قسم کی ذہنی اور اخلاقی فضا میں اہلِ پاکستان کا جو قومی کردار بن سکتا اسے سمجھنے کے لیے کسی عمیق مطالعہ اور مشاہدے کی ضرورت نہیں۔ ہر وہ شخص جو اس ملک میں زندگی کے دن پورے

کر رہا ہے۔ وہ خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

اگر اس ملک کے "اشراف" نے ایک طرف معاشرے کے اندر غلط رجحانات کو جنم دیا ہے تو دوسری طرف اپنے آپ کو بھی ایسے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی اندھی عقیدت میں گرفتار کیا ہے جن کے کارنامے انسانی تاریخ میں سیاہ ابواب کے عنوانات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں تو خیر ایک اچھی خاصی تعداد ایسے فرمانرواؤں کی رہی ہے جو اپنی نیکی، پاکبازی، حسنِ اخلاق اور خدا خوفی کی بنا پر فرمانرواؤں سے کہیں زیادہ درویش کہلانے کے مستحق تھے اور جن کی غیر معمولی فائدانہ اور انتظامی صلاحیتوں نے اسلامی قلمرو کو "جنتِ ارضی" بنا دیا تھا، مگر دوسری قوموں میں بھی بعض ایسے حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے جن کی وجہ سے انسانیت کو جور و جفا سے چھٹکارا حاصل ہوا اور اسے سکھ اور چین کی زندگی نصیب ہوئی۔ ہمارے ملک کے اصحابِ اقتدار کے دلوں میں ان نیک نفس حکمرانوں میں سے کسی حکمران کی پیروی کا جذبہ بھی پیدا نہیں ہوتا — ان کی نظروں میں ہر پھر کر ہٹلر، مسولینی، لینن اور سٹالن جیسے جابر حکمران ہی بطور آئیڈیل سماتے ہیں اور وہ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے لیے قریب قریب وہی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں جو وہ اپنے عہدِ اقتدار میں اختیار کرتے رہے ہیں اور عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد اُن کے طور طریقوں کو ہی وہ اپنے لیے نمونہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے افکار و نظریات اور ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ جابر اور ظالم حکمران ان کے روحانی اور سیاسی پیشوا ہیں اور اُن کی محبت اور عقیدت میں یہ درجہ فنا تک پہنچے ہوئے ہیں۔

ان جابر حکمرانوں کی کارگزاریوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو بعض رجحانات زمان و مکان اور معاشرتی و سیاسی حالات کے وسیع اختلافات کے باوجود سب میں مشترک نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلا رجحان جو دنیا کے سارے آمروں میں بڑی نمایاں حیثیت سے پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنے کے بجائے اُسے سطحی جذباتیت اور کھوکھلے نعروں کا خوگر بنایا جائے تاکہ وہ فہم و تدبر کے ساتھ کوئی قدم نہ اٹھا سکے اور جذباتی اور خوش کن نعروں کے سحر میں ہمیشہ گرفتار رہے اور جو شخص بھی زبان کے استعمال کے معاملے میں مطلق العنان، بلند بانگ دعوے کرنے میں ماہر ہو اور عوام کے جذبات

سے کھیلنے میں مشاق ہو وہ بلا سوچے سمجھے اور حقائق سے یکسر بے پروا ہو کر اُس کے پیچھے چل پڑے، اور جن کے پیچھے وہ اندھی ہو کر چل رہی ہے اُن سے یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ حضور! آخر آپ ہمیں کس منزل کی طرف لے جا رہے ہیں؟ اگر قوم کے جذبات میں اشتعال اور ہیجان کے بجائے ٹھہراؤ اور توازن ہو اور وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے کا فیصلہ عقل و فکر کی معتدل میزان پر تول کر کرنے کی عادی ہو تو اس قوم میں کبھی فرعون، نمرود، شداد پیدا نہیں ہوتے اور اگر کوئی سر پھرا یہ ناپاک عزم لے کر اٹھے بھی تو جلد ہی اس کی مذموم کوششوں کو ناکام بنا دیا جاتا ہے۔ فرعون اسی قوم میں اپنے رب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جو یا تو غیرت اور احساس سے یکسر محروم ہو چکی ہو یا اس کے جذبات میں اس حد تک تلاطم پیدا ہو چکا ہو کہ اُسے عقل کی بات بتانے والے اور حقائق سے آشنا کرنے والے اپنے دشمن نظر آتے ہوں اور دلفریب نعروں کے بل بوتے پر اُسے بیوقوف بنانے والے، ہمدرد اور خیر خواہ دکھائی دیتے ہوں۔

آمروں کے اندر دوسرا خطرناک رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ کسی طرح ملک اور قوم کے اندر بے یقینی، افراتفری، یاس، ناامیدی، انتشار اور طوائف الملوکی کی کیفیت پیدا ہو تاکہ عوام سراسیمہ ہو کر خود بخود اُن کے دام میں آجائیں۔ آمر یہ کام اُسی ذہنیت سے کرتے ہیں جس ذہنیت سے کہ مچھلیوں اور پرندوں کے شکاری پہلے تو جال پھیلاتے ہیں اور پھر ان آبی جانوروں اور پرندوں کے اندر سراسیمگی پیدا کر کے انہیں جال کی طرف دھکیلتے ہیں تاکہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ زیرِ دام آجائیں۔ افراتفری کی یہ فضا متعدد طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک معاشرہ جن اقدار پر قائم ہے یا جو روایات اس کے رگ و پے میں سرایت ہو چکی ہیں اُن کے خلاف عوام میں اور خصوصاً نوجوانوں کے اندر شدید جذبۂ نفرت و حقارت پیدا کرنا اور اُنہیں اس امر کا یقین دلانا کہ یہ مروجہ اقدار اور روایات محض اوہام اور بیکار کی زنجیریں ہیں جن کے ذریعے اُن کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جب بھی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے حصار کو مسمار اور روایات کے بندھنوں کو توڑا گیا تو اس کے نتیجے میں ہمیشہ قوم پر آمریت مسلط ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی اقدار اور روایات ہی انسانوں کے اندر نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں۔ ان کی حیثیت انسانی زندگی میں ایک ایسے داخلی قانون اور ضابطے کی ہی ہوتی ہے جن کی انسان خود پیروی پر آمادہ اور پابندی پر راضی (باقی صفحہ ۴۵ پر)